.....

آج کا دن گزر ہی جائے گا۔

پریس کلب کی اِس عمارت میں ہم نے جینے کے خواب دیکھے، زندگی کا حُسن چھیننے والوں کے خلاف صف آرا ہوئے، لہُولُہان ہوئے، لیکن سچائی کی لکیر ہمارے سینوں کے اندر جگمگاتی رہی۔ پرانی یادیں کُھلتی ہیں تو دل بہت تڑپتا ہے۔ آج بھی واحد بھائی کی نسبت سے ایک ایسی ہی یاد کا دریچہ کُھلا ہے۔ نیا ساز ہے، راگ بدلے گئے۔ مُراحمت کی جھلکیاں اب بھی وقفے وقفے سے اُبھرتی ہیں، لیکن ان کی یک جائی کے اسباب جیسے معدُوم ہوتے جا رہے ہیں۔ خواب دُھندلاہٹوں میں ڈُوب رہے ہیں۔ زمانہ سازی، ذاتی نُمود ونمایش، کُرسی کی ہوس اور مذہبی، لسانی اور علاقائی تعصّبات کا مضحکہ خیز تماشا سارے منظر کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے۔

یہ بیان شاید اُمید پرستوں کو ناگوار گزرے۔ اُمید پرستوں کی اُمید پرستی کا جھنڈا اونچا رہتا ہے، خواہ اُن کا عمل پاتال کی گہرائیوں میں دُبکا ہوا سسکیاں بھر رہا ہو۔

جب واحد بشیر کا تذکرہ آئے گا تو مُزاحمت اور جدوجہد کی ایک تاب ناک اور قابلِ فخر تصویر ہمارے سامنے رقص کرے گی۔ انہوں نے جب پہلا قدم اُٹھایا تو غم و آلام کی بھٹی میں سُلگنے والے بے کس، بے بس عوام کے لیے ذاتی راحتوں کو آگ لگانے والے سرفروشوں کا ایک ہجُوم اُن کے سامنے تھا۔ اس کہانی نے حیدرآباد دکن سے اپنا سر اُٹھایا، اور اس کی مہکار نے ان کے وُجود کو ہمیشہ کے لیے قربانیوں کے خارزار کا اسیر بنا دیا۔ ایسی اسیری پر سو آزادیاں قربان کی جا سکتی ہیں۔

سَو پیکاں تھے پیوستِ گُلو، جب چھیڑی شوق کی لَے ہم نے
سَو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

حیدرآباد دکن میں انقلاب کے نقارے کی تیز لَے پر جس شخص نے والہانہ رقص کا چلن عام کیا، اُس کا نام مخدوم محی الدین ہے۔ ایک دیوانہ جس نے فرزانگی کے مُروّجہ پیمانوں کی کرچیاں بکھیر کر مال مَنال کے اجارہ داروں کی پیشانیوں پر سیاہی تھوپ دی، اور ننگے بھوکے لوگوں کو سینے سے لگا کر والہانہ انداز میں نعرہ بلند کیا:

یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی
محکوموں کی، مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی
دہقانوں کی، مزدوروں کی
یہ جنگ ہے جنگِ آزادی
آزادی کے پرچم کے تلے

گمان گزرتا ہے کہ واحد بھائی کی شخصیت مخدوم کے اِسی نعرے کے سائے میں پروان چڑھی۔ اِنہوں نے مخدوم صاحب کو دیکھا، سُنا، کچھ دن ان کے ساتھ گزارے، اور ان کے ساتھ جلوس میں شامل ہو کر جنگِ آزادی کا یہ ترانہ بھی گایا۔ مخدوم کے پختہ کردار کا عکس واحد بھائی کی زندگی میں بھی نظر آتا ہے، اور مخدوم کی شاعری کے رجزیہ آہنگ کی دھمک اور رومانی لہجے کی گھلاوٹ ان کی نظموں اور غزلوں میں بھی گنگناتی محسوس ہوتی ہے۔

ان کی ایک نظم ''خواب اثر'' کی چند سطریں:

تحریر ہو، تقریر ہو، کافی نہیں دونوں
تحریر فقط معجزۂ رقصِ قلم ہے
تقریر فقط آئینۂ حُسنِ زباں ہے
جینا ہے تو ہر سانس کو اک تیشہ بنا لو
ہر ذرّۂ بے قدر سے خورشید تراشو

اب چند غزلیہ اشعار:

چشمِ تر کو رونے دو، اس قدر کہ خُوں برسے
مُدتوں مرادامن آنسوؤں کو ترسا ہے

رات ذکرِ غم سے یہ حاصل ہوا
سب کو اپنے زخم ہی گہرے لگے

آ گہی لمبا سفر ہے، اپنے بل پہ کاٹیے
راستے میں کون جانے کب، کہاں رہ جائے گا

جب سے کُھلی ہے آنکھ اِسی کربلا میں ہوں
پیاسا ہوں اور چھلکتے پیالوں کے درمیاں

ہونٹوں پہ ہمارے شعر کیسے
اپنے ہی لُہو کا ذائقہ ہے

مخدوم اور ان کے ساتھی نا منصفانہ معاشی نظام کو مٹا کر، جس میں کروڑوں لوگ بھوک کے انگارے نگلتے ہوئے اپنی قبروں میں اُتر جاتے ہیں، ایک اشتراکی معاشرے کے قیام کی راہ ہموار کر رہے تھے۔ اُس زمانے میں تلنگانہ اور کیرالہ کی انقلابی تحریکوں کا پورے ہندوستان میں چرچا تھا۔ انگریز اور سرمایہ دار بھی خائف تھے، اور رجعت پسند سیاسی جماعتیں بھی لرزہ براندام تھیں۔ ان تحریکوں میں ترقی پسند دانش وَروں نے، جن میں مخدوم پیش پیش تھے، کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کا نظریۂ حیات یہ تھا کہ معاشی تفریق کا نظام شرفِ آدمیت کی توہین ہے۔

واحد بھائی نے اس نظریے کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ اِس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے، اِن پر بھی گزری۔ تنہا پسِ زنداں، کبھی رُسوا سرِ بازار۔ لیکن وہ ابھی تک اپنے عہدِ وفا پر قائم ہیں۔

یہ 80 سال پہلے حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب شیخ الحدیث تھے۔ اِنہوں نے اپنے لیے الگ راستہ مُنتخب کیا۔ نویں جماعت کے بعد اسکول چھوڑ دیا اور ایک بٹن ساز فیکٹری میں ملازم ہو گئے۔ اُن ہی دنوں مخدوم صاحب کی قیادت میں مزدوروں کی ایک بڑی ہڑتال ہوئی۔ واحد بھائی نے بھی حصہ لیا اور مخدوم صاحب کو قریب سے دیکھا۔ 16 سال کی عمر میں فوج میں بھرتی ہوئے۔ دو سالہ تربیت کے بعد اسے داغِ مفارقت دے دیا۔ 1949 میں تنِ تنہا کراچی چلے آئے۔ کپڑے کا کاروبار کیا، گھاٹا اُٹھایا۔ میر پور خاص چلے گئے، جہاں سُنار کا کام سیکھا، پھر کراچی واپس آ کر آٹھ سال تک سُناری کا کام کرتے رہے۔ اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا، این ایس ایف کی رکنیت حاصل کی، لیکن نکال دیے گئے۔ پھر ایس ایم کالج میں داخلہ لیا۔ حکومت نے پریس کمیشن اور ایجوکیشن کمیشن تشکیل دیے تو انہوں نے اس پر اعتراضات کیے، جس کی پاداش میں سیکوریٹی ایکٹ آف پاکستان ایکٹ کے تحت تین مہینے تک جیل میں بند رہے۔ ایوب خاں کے دور میں ''تخریب کاری'' کے الزام میں جن 12 طلبہ کو شہر بدر کیا گیا، یہ بھی ان میں شامل تھے۔ شہر بدری کا سلسلہ ختم ہوا تو معاشی مجبوریوں کے تحت ایک اشتہاری کمپنی میں ملازم ہو گئے اور اسی دوران کراچی کوآرڈینیشن کونسل آف ٹریڈ یونینز سے بہ طور کارکن وابستہ ہو گئے۔ 1963 میں پھر گرفتار ہوئے، جلد چُھوٹ گئے۔ 1971 میں نام وَر مزدور لیڈر عثمان بلوچ کی سربراہی میں متحدہ مزدور فیڈریشن کا قیام عمل میں آیا۔ واحد بھائی اس کے آرگنائزنگ سیکریٹری تھے۔ متحدہ مزدور فیڈریشن کو ممتاز مزدور لیڈروں، نبی احمد اور ایس پی لودھی کی سرپرستی اور رہنمائی حاصل تھی۔ اس پلیٹ فارم سے مزدوروں کی متعدد تاریخ ساز تحریکوں نے جنم لیا۔ یہ قربانیوں کی ایک شان دار باب ہے، اسی لیے اسے مزدور تحریک کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ 1974 میں واحد بھائی نے ہفت روزہ ''الفتح'' سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ ضیاء الحق کے دور میں ''الفتح'' کی اشاعت پر پابندی عاید کر دی گئی، جو کچھ عرصے تک مختلف ناموں سے نکلتا رہا۔ جنوری 1982 میں ''الفتح'' کے دفتر پر چھاپا مار کر پورے عملے کو گرفتار کر لیا گیا۔ واحد بھائی بھی ڈیڑھ سال تک جیل میں بند رہے۔ رہائی کے بعد کچھ عرصے تک ایک ڈائجسٹ میں کام کیا، اور پھر 1984 میں روزنامہ ''بزنس ریکارڈر'' سے وابستہ ہو گئے، تاحال اسی ادارے سے مُنسلک ہیں۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ واحد بھائی نے محض زبان یا تحریر سے ننگے بھوکے عوام کے عذابوں کا نقشہ نہیں کھینچا، بلکہ ایک ہمہ وقتی کارکن بن کر ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصّہ لیا، یہاں تک کہ ایک مزدور بستی میں جا آباد ہوئے۔ مختصر سا مکان، بیوی، دو بچے، کھینچ تان کر درویشی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ ساری عمر غم جہاں کے مرض میں مبتلا رہے۔ ایک بار پھیپھڑے جواب دینے لگے، پھر بیمارِ دل نے آ جکڑا۔ اب اور بھی جسمانی عارضے لاحق ہیں۔ عمر خاصی بیت چکی، دیکھنے میں مُضمحل نظر آتے ہیں، سانس تھم تھم کے آتی ہے، لیکن حوصلے اب بھی جوان ہیں۔ ایمان اب بھی مضبوط ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین (سندھ) کے سیکریٹری بھی ہیں، ''ارتقاء'' کے محاذ پر بھی ڈٹے ہوئے ہیں، اور بزنس ریکارڈر میں اپنی صحافتی ذمے داریاں بھی باقاعدگی سے ادا کر رہے ہیں۔ حوصلے آگ کو گل زار بنا دیتے ہیں۔

نوجوانی میں ہمارے حوصلے بھی آتش و فولاد کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ اُسی زمانے میں پہلی ملاقات واحد بھائی سے ہوئی۔ ایس ایم کالج چھوڑنے کے بعد یہ اردو کالج میں داخل ہوئے تو قربتوں میں اور اضافہ ہوا۔ ڈیموکریٹک اسٹوڈینٹس فیڈریشن جیسی تاریخ ساز تنظیم کی جانشیں نیشنل اسٹوڈینٹس فیڈریشن ایک ایسی ملک گیر تنظیم تھی، جس سے تمام برسرِ اقتدار طبقے خائف رہے۔ اُنہوں نے تادیب و تعذیب کے تمام حربے آزمائے، لیکن کڑے سے کڑے وقت میں بھی این ایس ایف کے عزم کا عَلَم سرنِگوں نہیں ہوا۔ واحد بھائی اس تنظیم کے رہنماؤں میں شامل تھے، جب میں ایک جونیئر کارکن کی حیثیت سے اس کا حصّہ بنا۔ وہ ہم سے زیادہ تجربہ اور علم رکھتے تھے، اس کے باوجود دوستانہ انداز میں پیش آتے تھے، البتہ حمزہ باجی، جو بعد میں ان کی شریکِ حیات بنیں، اپنی ڈکٹیٹری جھاڑتی رہتی تھیں، جس کا ایک الگ لُطف تھا۔ بچھڑ گئیں، بہت یاد آتی ہیں، اور میرا سب سے عزیز دوست آغا جعفر بھی، جو اُن کا بھتیجا اور مشہور انقلابی اشرف دی گریٹ کا بیٹا تھا، ساتھ چھوڑ گیا۔ ہم روزانہ صُبح سے رات گئے تک ایک ساتھ وقت گزارتے تھے۔ اب بھی اکثر خوابوں میں آ کر باتیں کرتا ہے۔ اُس زمانے میں ہم سب کی سرخوشی کا عجیب عالم تھا، دُنیا کو بدلنے کا عزم، سام راج کے جبڑے توڑنے کا عزم، ظالموں کی آنکھوں میں اپنے طیش کے انگارے بھرنے کا عزم، انصاف کا گلستاں سجانے کا عزم۔ ہمارے رات دن جلسوں، جلوسوں، ہڑتالوں اور قسم قسم کے مظاہروں کی منصوبہ بندی میں گزرتے تھے۔

واحد بھائی کراچی سینٹرل جیل کے سامنے حیدرآباد کالونی کے ایک تنگ مکان میں اپنے دو دوستوں، قیوم اور کاظم کے ساتھ رہتے تھے۔ ہم نوجوان وہاں جمع ہو کر پمفلٹ لکھتے تھے، پلے کارڈ اور بینر بناتے تھے،

سیاہ جھنڈیاں اور سیاہ پٹیاں بناتے تھے، انقلابی نظمیں پڑھتے تھے، ادبی اور سیاسی بحثیں چھیڑتے تھے۔ اگرچہ این ایس ایف کے عام کارکنوں پر بھی سی آئی ڈی کڑی نظر رکھتی تھی، لیکن واحد بھائی اور دوسرے اہم لیڈروں کا سائے کی طرح تعاقب کیا جاتا تھا۔ ایوب خاں کا مارشل لا نافذ ہوا تو سب سے پہلے این ایس ایف نے بغاوت کا پرچم بلند کیا۔ یہ ذکر پہلے آچکا ہے کہ کس طرح بارہ طلبہ رہنماؤں کو، جن میں واحد بھائی بھی شامل تھے، نو ماہ تا ایک سال کے لیے شہر بدر کیا گیا۔ اس واقعے پر حبیب جالب نے ''شہر بدر طلبہ کے نام'' سے نظم لکھی، جو انہوں نے پہلی بار این ایس ایف کے کارکنوں کے ایک اجتماع میں سُنائی، جو ہمارے عزیز ساتھی اور لیڈر، نواز بٹ کے مکان پر منعقد ہوا:

فضا میں جس نے بھی اپنا لُہو اُچھال دیا
سِتم گروں نے اُسے شہر سے نکال دیا
یہی تو ہم سے رفیقانِ شب کو شکوہ ہے
کہ ہم نے صُبح کے رستے پہ خود کو ڈال دیا

اُسی زمانے میں واحد بھائی کی غزل کا یہ شعر بھی ہمارے وردِ زبان رہتا تھا ؎

زرد پتوں کے لیے ایک ہی جھونکا ہے بہت
نرم کونپل کی طرح پاؤں جمائے رکھیے

طالب علمی کا دور ختم ہوا تو یہ بہ راہِ راست مزدور تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ یہ ایک فطری عمل تھا، کیوں کہ این ایس ایف کے کارکن مزدوروں، ہاریوں اور دوسرے محنت کشوں کے قریبی حلیف تھے، اور عملی طور پر بھی ان کی تحریکوں میں دل و جان سے اپنا حصّہ ادا کرتے تھے۔ تاہم، واحد بھائی کا لگاؤ اس اعتبار سے مُنفرد ثابت ہوا کہ یہ مزدور تحریک کے ہمہ وقتی کارکن بن گئے اور مزدوروں ہی کے درمیان رہایش اختیار کرلی۔ اِنہوں نے اس شہر میں بہت سی ٹریڈ یونینیں بنائیں، مزدوروں کو اپنے حق کے لیے لڑنے کا راستہ دِکھایا۔ لیبر کورٹ سے لے کر جلسوں، جلوسوں اور ہڑتالوں کے ذریعے دوسرے مزدور رہنماؤں کی اعانت سے محنت کشوں کے حقوق کی جنگ کو زندہ رکھا۔

ٹریڈ یونین تحریک سے ان کی وابستگی کا عرصہ بہت طویل ہے۔ اِس کی تفصیل کے لیے ایک طویل دفتر درکار ہے، اور تفصیل پر میری نظر بھی نہیں ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ واحد بھائی اپنی یادداشتوں میں اِن گزرے واقعات کا تذکرہ کریں، اور یہ بھی بتائیں کہ مزدور تحریک اپنے اس شان دار ماضی سے بچھڑ کر کن عناصر کے باعث زوال پذیر ہوئی۔

اب یہ ایک طویل عرصے سے صحافت کے پیشے سے مُنسلک ہیں۔ پہلے پہل ہفت روزہ ''الفتح'' سے وابستہ ہوئے۔ ''الفتح'' کی اشاعت پر ضیاء الحق کے دور میں پابندی لگی، تو عملے کے دیگر ارکان کے ساتھ یہ بھی قید و بند کی صعوبتوں سے گزرے۔ اس کے بعد بزنس ریکارڈر میں ملازم ہوئے، جس سے اب تک ان کا رشتہ استوار چلا آتا ہے۔ صحافیوں کی تحریکوں میں بھی انہوں نے ہمیشہ فعال اور رہنمایانہ کردار ادا کیا ہے، جس سے آپ سب واقف ہیں۔ یہ اپنے نظریے سے دیوانہ وار محبت کرتے ہیں۔ اب اس کا اظہار ''ارتقا'' کے پلیٹ فارم سے ہوتا ہے، جو بلاشبہہ ایک بے مثل علمی جریدہ ہے۔ یہ رسالہ انہوں نے ہمارے قابلِ فخر ساتھیوں، حسن عابد، ڈاکٹر محمد علی صدیقی اور راحت سعید کی سنگت میں جاری کیا، جس کے شعبۂ ادارت میں اب ہمارے نہایت قابل دوست ڈاکٹر جعفر احمد کے نام کا اضافہ ہو چکا ہے۔ ''ارتقا'' اس اعتبار سے ایک مُنفرد رسالہ ہے کہ اس میں اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی تحریریں شامل ہوتی ہیں، جو اس پیغام کا سراغ دیتی ہیں کہ معاشرے میں ترقی پسند افکار کو فروغ دینا دانش ور طبقے کا سب سے مقدس فرض ہے، اس لیے اہلِ علم کو ظلم اور ناانصافی کے تمام مظاہر سے جنگ کرنے اور معاشرے میں رائج تقسیم دولت کے ظالمانہ نظام کو مٹانے کے لیے ہمیشہ مُتحرک اور سرگرم عمل رہنا چاہیے۔

واحد بھائی اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ انہیں حمزہ باجی جیسی شریکِ حیات کی رفاقت نصیب ہوئی، جو ان کی پُرعزم نظریاتی ساتھی بھی تھیں اور جنہوں نے پہلے طالب علموں کے محاذ پر اور پھر اساتذہ کے محاذ پر مسلسل جدوجہد کے ایک شان دار باب کا اضافہ کیا۔

واحد بھائی کی شخصیت کا ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ ایک دیدہ وَر اور ہُنر مند ادیب اور شاعر بھی ہیں۔ ''ارتقا'' اور دیگر رسائل میں ان کی بے شمار نثری اور منظوم تخلیقات کے علاوہ ''کیکٹس کے پھول'' اور ''جو اعتبار کیا'' کے نام سے ان کے دو شعری مجموعے بھی منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ اس پہلو پر کلام کے لیے طویل گفتگو درکار ہے، جس کا میں خود کو اہل نہیں سمجھتا۔ تاہم، اپنے انتہائی قابلِ احترام ساتھی اور اردو کے ممتاز ترین نقاد، ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی رائے کے بعد اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا:

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں، ''جب مجھے واحد بشیر کے مجموعۂ کلام ''کیکٹس کے پھول'' پر تحریر کرنے کی دعوت دی گئی تو میں نے اسے اپنے لیے اعزاز سمجھا، شاید اس لیے کہ واحد بشیر اپنے کلام کے بارے میں صرف ان ہی اشخاص کی تحریر کو خوش آمدید کہہ سکتے ہیں، جن کے بارے میں وہ خود کسی اُلجھن میں گرفتار نہ ہوں۔ واحد بشیر کے شعری مجموعے کی ہر نظم کی ایک ایک سطر جس بے ریا اور شفاف ذہنی لینڈ اسکیپ کی آئینہ دار ہے، وہ فی زمانہ ناپید نہیں تو خال خال ہی نظر آتی ہے۔ واحد بشیر کا فلسفۂ زندگی اور شعری بوطیقا ایک مستقل بالذات آدرش کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ مجھے واحد بشیر کی شاعری میں اس صدی کی نویں دہائی میں نظر آنے والی طبقاتی خلیج کی ڈرامائی اُتھل پتھل نظر آتی ہے۔''

آپ کو شاید یاد ہو، میں نے اپنی اس تحریر کا آغاز جس سطر سے کیا تھا، وہ یہ تھی: ''آج کا دن گزر ہی جائے گا''۔ یہ دراصل واحد بشیر کی ایک نظم ''8 جنوری'' کا انعکاس ہے۔ 8 جنوری 1953، جب کراچی میں پیراڈائز سنیما کے سامنے طلبہ پر گولیاں چلائی گئیں، جس سے سات طلبہ اور ایک بچہ شہید ہوئے، اور ڈیڑھ سو سے زاید طلبہ اور راہ گیر زخمی ہوئے۔ اس خوب صورت نظم کے ساتھ میں اپنی ان گذارشات کا اختتام کرتا ہوں۔

آج کا دن گزر گیا یوں ہی
جیسے سب دن گزر ہی جاتے ہیں
جانے کیوں اب کسی کو یاد نہیں

آج کے دن ہی نوجوانوں نے
اپنے پُختہ شعور کے بل پر
علم پر اپنا حق جتایا تھا
راستہ جہد کا دِکھایا تھا
کس کو فرصت ہے اُن کو یاد کرے
اب کہ تعلیم اک تجارت ہے
درس گاہیں کُھلے ہوئے بازار
حق تو اُس کا ہے جو ہے طاقت وَر
اور سب کچھ ہے قصّۂ بے کار
آج کا دن گزر گیا یوں ہی
آج کا دن یوں ہی گزرنا تھا

سو، آج کا دن بھی گزر جائے گا، جب تک ہمیں ایک دوسرے سے ''سمٹے چمٹے'' رہنا ہے، جیسا کہ آپ نے ہم سب کے محبوب خالد علیگ کی موت پر اپنی نظم ''پت جھڑ'' میں کہا تھا:

بدلتے موسموں کے
اک ایسے موڑ پر
کہ جب ایک ایک کر کے
سنگی ساتھی
سوکھے پتوں جیسے
ہوا میں اُڑ جاتے ہیں
کبھی نہ واپس آنے کو
بچ رہنے والے پتوں کو
اک دُوجے سے
سمٹے، چمٹے رہنا ہے
نئے موسم کے آنے تک
نئے پتوں کے اُگنے تک

تو واحد بھائی، اب کہ عمر کے اس حصے میں ہم دونوں اور ہمارے بہت سارے ساتھی خزاں کے آخری جھونکے کی راہ دیکھ رہے ہیں، اس سے خُوب صورت بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے بکھرے خوابوں اور بچھڑی یادوں کی گٹھری سنبھالے ایک دوسرے کے ساتھ سمٹے چمٹے رہیں۔

(15 مئی، 2010)